مذاکرۂ علمیہ

مسئلۂ جبر و قدر

(۶)

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو اشاعت ماہ شعبان ۱۳۵۲ھ)

پس تقدیر پر عقیدہ رکھنے کی جو تعلیم قرآن حکیم میں دی گئی ہے۔ اس کا اصل مقصود یہ ہے کہ انسان دنیا کی تمام قوتوں سے حقیقی تاثیر اور نفع و ضرر کی قدرت کو سلب کر کے، صرف خدا کو فاعل و مؤثر، اور نافع و ضار سمجھے، اور اپنے سب معاملات میں اسی پر بھروسہ کرے۔ اگر مصیبت آئے تو مایوس نہ ہو۔ خودداری کے اعلیٰ مقام سے نہ گرے، مخلوقات کے سامنے ذلت نہ اختیار کرے، اور اگر راحت میسر ہو تو اس پر پھولے نہیں، غرور و نخوت کو اپنے نفس میں جگہ نہ دے، اور خدا کی زمین پر سرکشی و تکبر نہ اختیار کرے۔ یہی بات ہے جو سورۃ الحدید میں بیان کی گئی ہے۔

مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِىْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (۳)

جو مصیبت بھی زمین میں آتی ہے، یا خود تم پر نازل ہوتی ہے، وہ پیش آنے سے پہلے ہی ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہے اور یہ اللہ کے لئے ایک سہل سی بات ہے تم کو یہ بات اس لئے بتا دی گئی کہ جو کچھ نقصان تم کو پہنچے اس پر دلشکستہ نہ ہو، اور جو کچھ خدا تم کو عطا کرے اس پر اترا نہ جاؤ۔ اللہ کسی اکڑنے اور اترانے والے کو پسند نہیں کرتا۔

عقیدۂ تقدیر کا فائدہ عملی زندگی میں | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کی زندگی کے تمام معاملات میں یہی

روح پھونکنے کی کوشش فرمایا کرتے تھے کیونکہ اس سے اخلاق پر ایک خاص اثر پڑتا ہے، اور اگر لوگوں کے دلوں میں یہ چیز بیٹھ جائے، تو بڑے بڑے تمدنی، سیاسی، معاشی مسائل آپ سے آپ حل ہو جاتے ہیں، بلکہ پیدا ہی نہیں ہوتے (مثال کے طور پر دو حدیثیں ملاحظہ ہوں۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا لا یحل لامرأۃ تسأل طلاق اختہا لتستفرغ صحفتہا فانما لہا ما قدر لہا[1]۔ کسی عورت کے لئے یہ حلال نہیں ہے کہ وہ اپنی دوسری بہن (یعنی سوکن) کو طلاق دیے کا مطالبہ اس خیال سے کرے کہ اس کے تمتعات و حظوظ میں کوئی دوسرا شریک نہ رہے، اور رزق کا پیالہ تنہا اس کے لئے خالی ہو جائے۔ اس لئے کہ بہر صورت اس کو وہی ملے گا جو اس کے لئے مقدر کر دیا گیا ہے"۔

ایک دوسری حدیث میں ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک غزوہ میں بہت سی لونڈیاں ہمارے ہاتھ آئیں اور ہم نے ان سے تمتع کیا، مگر اس خیال سے کہ اولاد نہ ہو عزل[2] کرتے تھے۔ پھر ہم نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اس کا حکم پوچھا۔ آپ نے سنتے ہی فرمایا۔ او انکم لتفعلون؟ کیا واقعی تم ایسا کرتے ہو؟ یہی سوال آپ نے تین مرتبہ دہرایا۔ پھر فرمایا ما من نسمۃ کائنۃ الی یوم القیمۃ الا ھی کائنۃ[3]۔ قیامت کے دن تک جو بچے پیدا ہونے ہیں وہ تو پیدا ہو کر ہی رہیں گے۔

ان دونوں حدیثوں میں جن اصول کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے، اگر ان کو وسعت کے ساتھ ہم اپنی زندگی کے معاملات میں استعمال کریں، تو وہ معاشی کشمکش اور مزاحمت جس نے دنیا سے سکون و اطمینان چھین لیا ہے کس قدر جلد ختم ہو جائے۔ نہ کوئی کسی کو اپنے رزق کا چھیننے والا سمجھے، اور نہ اپنے رزق کی حفاظت

---

[1] بخاری کتاب النکاح باب الشروط التی لا تحل فی النکاح۔ اسی کے قریب قریب بیہقی اور ابو نعیم اصبہانی نے دوسرے طریقوں سے نقل کیا ہے۔ علامہ ابن عبد البر لکھتے ہیں کہ "اہل علم کے نزدیک یہ حدیث ان تمام احادیث میں سب سے بہتر ہے جو تقدیر کے مسئلہ میں منقول ہیں۔ اس کا منشا یہ ہے کہ اگر شوہر عورت کی بات مان بھی لے اور اس بیوی کو طلاق بھی دیدے جس کے متعلق وہ عورت یہ گمان کرتی ہے کہ وہ اس کے رزق میں شریک ہو جائے گی۔ تب بھی اس تدبیر سے اس کو کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس کو صرف اتنا ہی حصہ ملیگا جتنا خدا نے اس کے لئے لکھ دیا ہے، خواہ شوہر اس کی شرط قبول کرے یا نہ کرے۔ [2] العزل، النزع بعد الایلاج لینزل خارج الفرج۔ [3] بخاری کتاب النکاح باب العزل۔

کے لئے کسی کی مزاحمت کرے، نہ سرمایہ دار اور مزدور کا سوال پیدا ہو، اور نہ کسان و زمیندار کا، نہ کروگراڈ میل زہاروف پیدا ہوں، نہ لینن اور اسٹالین۔ نہ معاشی اور تمدنی مشکلات کو حل کرنے کے لئے استقاط حمل اور منع حمل کی طرف رجوع کیا جائے، اور نہ اللہ کے انتظام میں اصلاح کی کوشش کی جائے۔

یہ اور ایسے ہی بے شمار اخلاقی اور عملی فوائد ہیں جو قضا و قدر کی اسلامی تعلیم سے حاصل ہوتے ہیں اور انہی فوائد کا حصول اصل مقصود بھی تھا۔ مگر ہماری بدقسمتی کہ ہم نے اس کے عملی اور اخلاقی پہلو کو نظر انداز کرکے اپنی ساری توجہات فلسفیانہ پہلو کی طرف پھیر دیں، اور اپنے مذاق طبیعت کے مطابق کلام اللہ اور کلام رسولؐ سے ان مسائل فلسفہ کو حل کرنے لگے جو کلام الناس سے ہم نے اخذ کئے تھے۔ حالانکہ نہ قرآن مجید ہم کو مابعد الطبیعیات کی تعلیم دینے کے لئے اتارا گیا تھا۔ نہ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ آپ فلسفہ کے پروفیسر کا کام انجام دیں، اور نہ خدا اور رسول نے کبھی اس کو پسند کیا کہ ہم اپنی زندگی کے عملی معاملات کو چھوڑ کر ان مابعد الطبیعی مسائل میں الجھ جائیں جن سے دین یا دنیا کا کوئی فائدہ حاصل ہونے والا نہیں ہے۔

تناقض کی تحقیق یہ مقدمہ ذہن نشین کر لینے کے بعد اب اس سوال کی طرف آیئے کہ قرآن مجید میں خاص تقدیر کے مسئلہ سے بحث کئے بغیر جو مختلف اشارات ضمناً دوسرے مباحث کے سلسلہ میں اس کی جانب کئے گئے ہیں آیا ان میں حقیقۃً کوئی تناقض ہے یا نہیں؟

اگر کسی شئے کو مختلف علتوں کی جانب منسوب کیا جائے تو اس پر تناقض کا حکم صرف اس صورت میں لگایا جا سکتا ہے۔ جب کہ اس شئے کی صرف ایک ہی علت ہو سکتی ہو۔ لیکن اگر اس کی متعدد علتیں ہوں تو ایسی صورت میں اس کو کبھی ایک علت کی جانب اور کبھی دوسری علت کی جانب نسبت دینے میں کوئی تناقض نہ ہوگا۔ مثلاً اگر ہم کبھی یہ کہیں کہ کاغذ کو پانی نے تر کیا اور کبھی یہ کہ اسے آگ نے تر کیا۔ اور کبھی یہ کہ اسے مٹی نے تر کیا۔ تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ تم نے متناقض باتیں کہی ہیں، کیونکہ کاغذ کی تری تو ایک ہی

علت کی طرف منسوب ہو سکتی ہے لیکن اگر ہم کبھی یہ کہیں کہ ملک کو بادشاہ نے فتح کیا، اور کبھی یہ کہ ملک کو سپہ سالار نے فتح کیا، اور کبھی یہ کہ اسے فوج نے فتح کیا، اور کبھی یہ کہ اسے سلطنت نے فتح کیا، اور کبھی اس فتح کو فرداً فرداً ہر سپاہی کی طرف منسوب کریں، تو ان مختلف اقوال پر تناقض کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ اس لئے کہ یہ فتح کا واقعہ مجموعی طور پر ان سب کی طرف بھی منسوب ہو سکتا ہے، اور ایک ایک وجہ سے، ان علتوں میں سے ہر علت کی طرف بھی۔

پھر اگر کسی شئے میں متعدد علتوں کی تاثیرات اس طرح خلط ملط ہوں کہ مخاطب کی عقل کسی طور سے اسکے اندر ہر علت کی تاثیر کو جدا جدا کرکے، ہر ایک کا حصہ الگ الگ متعین نہ کر سکتی ہو، اور نہ ایسے کسی تجزیہ و تحلیل، اور اس طرح کے کسی حساب کو سمجھ سکتی ہو، تو اس صورت میں متکلم کے لئے صحیح انداز بیان یہی ہو سکتا ہے کہ وہ اجمال کے طور پر اس شئے کو ایک ایک علت کی طرف منسوب کرے، اور اگر مخاطب کسی غلط فہمی کی بنا پر اس شئے کو صرف ایک ہی علت کی جانب نسبت دے رہا ہو تو اس کی تردید کر دے۔ مثال کے طور پر اسی فتح کے واقعہ کو لیجئے۔ اس میں بادشاہ، سپہ سالار، فوج، سلطنت۔ اور فرداً فرداً ہر سپاہی کی قوتیں شریک ہیں۔ مگر وہ اس طرح باہم ملی جلی ہیں کہ ہم کسی تجزیہ و تحلیل اور کسی حساب سے یہ معلوم نہیں کر سکتے کہ اس واقعہ کے اندر ہر ایک کا حصہ کس قدر ہے۔ اس لئے زیادہ صحیح یہ ہوگا کہ اس واقعہ کو ان میں سے ہر ایک کی طرف بر سبیل اجمال نسبت دی جائے۔ اور اگر کوئی شخص ان میں سے محض کسی ایک کی طرف اس کو حصر و تعیین کے طور پر منسوب کر رہا ہو۔ تو کہہ دیا جائے کہ اس کا قول غلط ہے۔

یہی حال انسان کے افعال کا ہے۔ ہر فعل جو انسان سے سرزد ہوتا ہے اس میں متعدد اسباب شامل ہوتے ہیں، اور اس کے ظہور و صدور میں ہر سبب کا کچھ نہ کچھ حصہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر میں اس وقت لکھ رہا ہوں۔ میرے اس فعل کتابت کا تجزیہ کیجئے تو اس میں اسباب کا ایک پورا سلسلہ آپ کو نظر آئے گا۔ مثلاً لکھنے کے لئے میرا اختیار و ارادہ، میرے اندر جو بے شمار ذہنی اور جسمانی قوتیں موجود ہیں ان سب کا اس

ارادہ کے تحت کام کرنا۔ اور خارجی قوتوں کا جو بے حد حساب ہیں اور جن میں سے بہت سی قوتیں میرے علم میں بھی نہیں ہیں، میری مساعدت کرنا۔

پھر ان اسباب کی الگ الگ تحلیل کیجئے۔ یہ بے شمار خارجی قوتیں جو اس وقت اس فعل میں میری مساعدت کر رہی ہیں۔ ان میں سے کسی کو بھی نہ میں نے بنایا ہے نہ فراہم کیا ہے نہ میں ان پر اتنی قدرت رکھتا ہوں کہ انہیں اپنی مساعدت پر مجبور کر سکوں۔ وہ خدا ہی ہے جس نے ان کو اس طور پر بنایا اور اس طرح فراہم کر دیا ہے کہ جب میں لکھنے کا ارادہ کرتا ہوں تو یہ ساری قوتیں میری مساعدت کرنے لگتی ہیں۔ اور اگر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ میری مساعدت نہ کریں تو میں لکھ نہیں سکتا۔

اسی طرح جب میں خود اپنے اوپر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میرا موجود اور زندہ ہونا، میرا احسن تقویم پر ہونا، میرے جسم کے ان اعضاء کا جو کتابت کے فعل میں حصہ لیتے ہیں، صحیح و سلامت ہونا میرے اندر ان طبعی قوتوں کا موجود ہونا جن سے میں اس فعل میں کام لیتا ہوں، اور میرے دماغ میں حافظہ، تفکر، علم اور دوسری بہت سی چیزوں کا پایا جانا، ان میں سے کوئی امر بھی نہ میری کاریگری کا نتیجہ ہے، نہ میرے اختیار میں ہے۔ ان سب کو بھی اسی خدا نے اس طور پر بنایا ہے کہ جب میں لکھنے کا ارادہ کرتا ہوں تو یہ سب چیزیں میرا ساتھ دیتی ہیں، اور اگر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک شئے میرا ساتھ نہ دے تو میں کتابت کے فعل میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

رہا میرا اختیار و ارادہ تو اس کی حقیقت بھی میں نہیں جانتا۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ پہلے کچھ خارجی اسباب اور کچھ باطنی اسباب سے میرے اندر لکھنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے پھر میں غور کرتا ہوں کہ لکھوں یا نہ لکھوں۔ پھر دونوں پہلوؤں کے درمیان موازنہ کرنے کے بعد میں لکھنے کے پہلو کو اختیار کرتا ہوں، اور جب میرا میلان فعل کی جانب قوی ہو جاتا ہے تو فعل کا ارادہ کر کے اپنے اعضاء کو اس کے لئے حرکت دیتا ہوں۔ اس خواہش سے لے کر اقدام فعل تک جتنی چیزیں ہیں ان میں سے

کسی چیز کا بھی میں خالق نہیں ہوں، بلکہ مجھے ابتک یہ بھی پوری طرح معلوم نہیں ہوسکا ہے کہ خواہش اور اقدام فعل کے درمیان کتنی باطنی قوتیں کام کرتی ہیں۔ اور اس کام میں ان کا کتنا کتنا حصہ ہے۔ مگر یہ بات وجدانی طور پر میں اپنے اندر پاتا ہوں کہ خواہش اور اقدام فعل کے درمیان کوئی مقام ایسا ضرور ہے جہاں میں فعل اور ترک فعل میں سے کسی ایک چیز کو آزادانہ اختیار کرتا ہوں اور جب میں آزادی کے ساتھ کسی ایک پہلو کو اختیار کر لیتا ہوں تو مجھے یہ قدرت اپنے اندر محسوس ہوتی ہے کہ جس پہلو کو میں نے اختیار کیا ہے اس کے لحاظ سے اپنے وسائل داخلی اور اسباب خارجی کو استعمال کروں میں اپنے اس اختیار اور آزادیٔ ارادہ کو کسی دلیل سے ثابت نہیں کرسکتا۔ مگر کوئی دلیل میرے اور کسی انسان کے ذہن سے اس وجدانی احساس کو دور نہیں کرسکتی حتیٰ کہ جو شخص انتہا درجہ کا جبریہ ہے۔ اس کا وجدان بھی اس احساس سے خالی نہیں ہے، خواہ وہ اپنے فلسفیانہ مسلک کی خاطر کتنی ہی شدت کے ساتھ اس کا انکار کرتا ہو۔

اس تقریر سے معلوم ہوا کہ فعل کتابت کے صدور میں جتنے اسباب وعلل کام کرتے ہیں ان کو تین جدا جدا سلسلوں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ وہ خارجی اور داخلی اسباب جن کا فراہم ہونا کتابت کا ارادہ کرنے سے پہلے ضروری ہے۔

۲۔ میرا کتابت کو اختیار کرکے اس کا ارادہ کرنا۔

۳۔ وہ خارجی اور داخلی اسباب جن کی مساعدت کے بغیر لکھنے کے فعل کا صادر ہونا ممکن نہیں ہے۔

ان تینوں سلسلوں میں سے پہلے اور تیسرے سلسلہ میں جتنے اسباب ہیں ان کے متعلق تو اوپر کہا جاچکا ہے کہ ان کو خدا نے فراہم کیا اور سازگار بنایا ہے، اور ان میں سے کسی پر بھی میری حکومت نہیں ہے۔ اس لئے ان کے اعتبار سے میرا فعل کتابت خدا ہی کی طرف منسوب ہوگا۔ جس کی "توفیق" اس کام میں میرے شامل حال ہوی ہے۔ رہی بیچ کی کڑی تو وہ ایک وجہ سے میری طرف منسوب ہوگی کیونکہ وہاں

میں نے ایک طرح کا آزادانہ اختیار اور ارادہ استعمال کیا ہے، اور ایک وجہ سے وہ خدا کی طرف منسوب ہو گی جس نے اپنی مقرر کردہ حدود کے اندر مجھ میں یہ قوت پیدا کی کہ ارادہ کروں اور آزادی کے ساتھ اپنا اختیار استعمال کروں[1]۔

یہ تو تھا مجرد فعل کا حال جو اپنی حقیقت میں بجز ایک حرکت کے اور کچھ نہیں ہے لیکن انسانی افعال بعض اضافی اور اعتباری حیثیتوں سے اپنے دو پہلو رکھتے ہیں۔ ایک خیر کا پہلو اور دوسرا شر کا پہلو۔ مجرد فعل پر نہ خیر کا حکم لگایا جا سکتا ہے اور نہ شر کا۔ البتہ انسان کی نیت اس کو شر بھی بنا سکتی ہے اور خیر بھی (اِنَّمَا الاَعمَالُ بِالنِّیات) مثال کے طور پر میں راستے میں ایک اشرفی پڑی ہوئی دیکھتا ہوں اور اسے اٹھا لیتا ہوں۔ میرا اس کو اٹھا لینا محض ایک حرکت ہے جو نیک اور بد دونوں حیثیتوں سے خالی ہے لیکن اگر اس اٹھا لینے کے فعل میں میری نیت یہ ہے کہ میں دوسرے کے مال سے بلا کسی حق کے خود فائدہ اٹھاؤں تو یہ شر ہے۔ اور اگر میری نیت یہ ہے کہ اس کے مالک کو تلاش کر کے اسے واپس دیدوں تو یہ خیر ہے۔ صورت اول میں میری نیت کے ساتھ ایک اور قوت کی تحریک بھی شامل ہو گی

---

[1] یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قرآن مجید میں ان تمام امور کو جو انسان کے اختیار سے باہر ہیں خدا کی طرف منسوب کیا گیا ہے، اور خود انسان کے اختیاری افعال کو بھی بسا اوقات خدا کی طرف نسبت دی گئی ہے۔ اس لئے کہ انسان جن افعال کو اپنے اختیار و ارادہ کے تحت انجام دیتا ہے وہ بھی خدا کی توفیق کے بغیر پورے نہیں ہو سکتے حتیٰ کہ خواہش بھی جو تمام افعال انسانی کا مبدا ہے، انسان کے اپنے بس کی چیز نہیں ہے۔ وہ ان اسباب و علل کے اثر سے پیدا ہوتی ہے جو مشیت الٰہی کے تحت حرکت کرتے ہیں یہی معنی ہیں وَمَا تَشَاؤُنَ اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ اللّٰہُ کے۔ اسی طرح جن افعال میں انسان اپنی قوت تمیز، قوت فیصلہ اور قوت ارادی کو استعمال کرتا ہے، اور جن افعال کو وہ خوب سوچ سمجھ کر تمام پہلوؤں کو جانچ تول کر انجام دیتا ہے ان کے اندر بھی اس کی پیدائشی سرشت، ماحول کے اثرات، وراثت اور تعلیم و تربیت کی تاثیرات اور فراہم شدہ اسباب و علل کی ہیئت اجتماعی کا بہت کچھ دخل ہوتا ہے اور یہ سب چیزیں مل جل کر اس کے اختیار تمیزی کو (جو خالصۃً اس کا اپنا ہے) اس حد تک متاثر کر دیتی ہیں کہ عمل کا جو راستہ بھی وہ انتخاب کرتا ہے وہ محض اس کے اپنے انتخاب کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ اب یہ ظاہر ہے کہ ان عوامل کا ہر شخص کی زندگی میں ہر موقع پر ایک خاص ہیئت کے ساتھ مجتمع ہونا جس پر اس شخص کی ہدایت و ضلالت کامیابی و ناکامی کا بہت کچھ انحصار ہے، خدا ہی کی مشیت پر موقوف ہے پس یہ خدا کا عین انصاف اور اپنے بندوں پر اس کا عین فضل ہے کہ اس نے انسان کے خطا و صواب، گمراہی اور راست روی، فلاح اور خسران کی ذمہ داری تنہا انسان پر نہیں ڈالی ہے۔ بلکہ ایک وجہ سے ان تمام امور کو اپنی مشیت پر بھی مبنی قرار دیا ہے۔

جس کو شیطان کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اور میرا یہ فعل تین علتوں کی طرف منسوب ہوگا۔ ایک خدا، دوسرے شیطان، تیسرا خود میں صورت دوم میں اس فعل کی نسبت دو علتوں کی جانب ہوگی۔ ایک خدا دوسرا میں۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہم ہر انسانی فعل کو دو یا تین علتوں کی طرف منسوب کر سکتے ہیں۔ مگر یہ کسی طرح ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا کہ فعل میں ان دو یا تین علتوں کی تاثیر کس کس مقدار میں ہے خصوصاً یہ حساب اس حیثیت سے اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے کہ ان تاثیرات کا تناسب تمام انسانوں کے افعال میں یکساں نہیں ہے، بلکہ ہر انسان کے فعل میں جداگانہ ہے۔ اس لئے کہ ہر انسان کے اندر اس کے آزادانہ اختیار اور اس کی مجبوریوں کی مقادیر مختلف ہوتی ہیں۔ کوئی مبدأ فیاض سے زیادہ زبردست قوت تمیز، زیادہ صحیح قوت فیصلہ، ملکوتیت کی جانب زیادہ قوی میلان، اور شیطانی وساوس کا مقابلہ کرنیکی زیادہ طاقت لے کر آیا ہے، اور کوئی کم۔ اور اسی کمی وزیادتی پر، جس کا تناسب ہر شخص کے اندر مختلف ہے، افعال میں انسان کی شخصی ذمہ داری کے کم یا زیادہ ہونیکا انحصار ہے، ایسی حالت میں یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ افعال میں انسان، خدا، اور شیطان کی تاثیرات کا کوئی ایسا تناسب بتایا جاسکے جو عمومیت کے ساتھ تمام انسانی افعال میں پایا جاتا ہو۔

پس جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، انسانی افعال کو ان کی علتوں کی طرف نسبت دینے کی صحیح صورت بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ اجمال کے طور پر ان کو یا تو بیک وقت تمام علتوں کی طرف منسوب کیا جائے یا کبھی ایک علت کی جانب اور کبھی دوسری علت کی جانب۔ اور اگر کوئی شخص غلط فہمی سے ان کو صرف ایک علت کی طرف نسبت دے کر دوسری علتوں کی نفی کرتا ہو تو اس کی تردید کر دی جائے۔

ٹھیک یہی طریقہ ہے جو قرآن مجید میں اختیار کیا گیا ہے اگر آپ ان اشارات کا تتبع کریں، جو قرآن مجید میں مسئلہ جبر و قدر کی طرف کئے گئے ہیں۔ تو ان کو حسب ذیل عنوانات کے تحت مرتب کر سکتے ہیں

نسبت کل افعال الی اللہ (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو بقرہ ۱۲-۱۴-۲۰-۲۶-آل عمران ۱۶-۱۷-نسار-۱۱-انعام ۳ رعد-۲-ابراہیم-۱-فاطر-۲-شوریٰ-۲-۳-فتح-۲)

نسبت خیر الی اللہ (بقرہ ۱۷-۳۴-نسار-۱۱-مائدہ-۸-انعام-۱۵)

نسبت خیر الی العباد (بقرہ ۳۸-آل عمران ۶-فاطر ۳-زمر ۴-احقاف ۲-نجم ۳-دہر ۲-نبار ۲-مزمل ۱-)

نسبت شر الی اللہ (نسار ۱۲-مائدہ ۶-انعام ۱۵-بنی اسرائیل ۵)-

نسبت شر الی الشیطان- (بقرہ ۳۴-وغیرہ)

نسبت شر الی العباد (بقرہ ۱-۴-۵ تا ۹-۱۳-۱۵-۲۱-آل عمران ۶-۷-۱۲-۱۷-۱۸-نسار-۱۱-مائدہ-۱۰-۱۱-انعام ۱-۲-۱۳-۱۵-اعراف ۲۰-انفال-۷-توبہ ۹-یونس ۲-رعد ۲-فاطر ۳-زمر ۳-۴-۷-حم سجدہ ۲-حدید ۴-تحریم ۱-نبار ۲-فجر-زلزال-)

ایک ہی شے کی نسبت خدا اور بندہ کی جانب (بقرہ ۱۲-آل عمران ۱۷-نحل ۱۳-طٰہٰ ۳)

ایک ہی شئے کی نسبت خدا اور شیطان کی جانب (بقرہ ۳)

خیر کی ابتدا انسان کی جانب سے اور تکمیل خدا کی جانب سے (رعد ۴-نحل ۱۴-حج ۷-عنکبوت ۷-محمدؐ ۲-تکویر-اعلیٰ-لیل-)

شر کی ابتدا انسان کی جانب سے اور تکمیل خدا کی جانب سے (بقرہ ۱-۲-نسار ۲۲-اعراف ۱۳-۱۷-انفال ۷-توبہ ۱۶-رعد ۲-صف ۱-)

پھر جہاں انسان نے اپنے گناہ کی ذمہ داری خدا پر ڈال کر خود بری الذمہ ہونا چاہا وہاں اس کی تردید کر دی گئی- مثلاً-

وَقَالُوا لَوْ شَاءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ (۴۳ : ۲)

اور انہوں نے کہا کہ اگر رحمٰن چاہتا تو ہم ان فرشتوں کی پرستش نہ کرتے لیکن ان کو اس معاملہ (مشیت الٰہی) کا کوئی علم نہیں ہے۔ وہ محض اٹکل سے یہ باتیں کہتے ہیں۔

وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا عَلَيْهَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۷ : ۳)۔

اور جب انہوں نے کوئی بڑا کام کیا تو کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے اور اللہ نے ہم کو اس کا حکم دیا ہے۔ اے پیغمبر ان سے کہدے کہ اللہ بُری باتوں کا حکم نہیں دیتا۔ کیا تم اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کہتے ہو جن کا تم کو علم نہیں ہے۔

اور جہاں انسان نے اپنی ہی تدبیر کو سب کچھ سمجھا اور تقدیر الٰہی کا انکار کیا وہاں اس کی بھی تردید کردی گئی مثلاً

يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ (۳ : ۱۶)

وہ کہتے ہیں کہ اگر معاملات کے طے کرنے میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہوتا تو ہمارے آدمی وہاں (میدان جنگ میں) نہ مارے جاتے۔ اے پیغمبر ان سے کہو کہ اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن کے لئے مارا جانا لکھدیا گیا ہے وہ اپنے بچھڑنے کی جگہوں پر خود جا پہنچتے۔

حقیقت کی پردہ کشائی اس بحث سے یہ بات تو صاف ہوگئی کہ قرآن مجید میں مسئلہ جبر و قدر کے متعلق جو اشارات مختلف مواقع پر کئے گئے ہیں، ان میں درحقیقت کوئی تناقض و تعارض نہیں ہے لیکن ایک سوال پھر بھی باقی رہ گیا، اور وہ یہ ہے کہ مخلوقات عالم میں انسان کی وہ کونسی امتیازی حیثیت ہے جس کے لحاظ سے ایک طرف تو وہ تمام موجودات کی طرح خدا کا محکوم ہے قوانین خداوندی میں جکڑا ہوا ہے، بندہ ہے

مجبور ہے۔ اور دوسری طرف اپنے افعال میں مختار بھی ہے، اپنے اعمال کا ذمہ دار بھی ہے، اپنی حرکات وسکنات کے لئے جواب دہ بھی ہے۔ جزا اور سزا کا مستحق بھی ہے؟ نیز جب انسان کا حال یہ ہے اور اس کی زندگی میں جبر اور اختیار اسی طرح ملے جلے ہیں، تو عدل کیونکر ممکن ہے؟ اس لئے کہ صحیح انصاف کے ساتھ جزا و سزا کا فیصلہ کرنا بغیر اس تحقیق کے ممکن نہیں ہے کہ اس کے افعال کی ذمہ داری خود اس پر کس حد تک ہے؟ اور ذمہ داری کی تشخیص بغیر یہ معلوم کئے نہیں ہوسکتی کہ اس کے افعال میں اس کے آزادانہ اختیار کا کتنا حصہ ہے؟ اس مسئلہ کی تحقیق کیلئے جب ہم قرآن مجید پر نظر ڈالتے ہیں تو اس سے ہم کو ایک ایسا تشفی بخش جواب ملتا ہے، جو دنیا کی کسی دوسری کتاب، اور دنیا کے کسی انسانی علم وفن سے نہیں ملتا۔

مخلوقات میں انسان کی امتیازی حیثیت

قرآن ہمیں خبر دیتا ہے کہ انسان کی پیدائش سے پہلے کائنات میں مخلوقات کی جتنی انواع موجود تھیں وہ سب اپنی فطرت کے لحاظ سے اطاعت کیش واقع ہوئی تھیں۔ اختیار اور ارادہ کی قوت سرے سے ان کو دی ہی نہیں گئی تھی۔ ان کا کام صرف یہ تھا کہ جس کے سپرد جو خدمت کر دی گئی ہے، اس کو وہ ایک قانون اور ایک نظام کے مطابق، ذرہ برابر سرکشی کئے بغیر بجا لاتا رہے۔ ان میں سب سے افضل مخلوق فرشتے تھے جن کے متعلق حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ لَا يَعْصُونَ اللّٰهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ (۶۶: ۱) اسی طرح اجرام فلکی کی عظیم الشان ہستیاں تھیں جن کا حال یہ تھا۔ وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ۔ لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ (۳۶: ۳)۔ یہی حال آسمان وزمین کی دوسری مخلوقات کا تھا۔ کہ كُلٌّ لَّهُ قَانِتُونَ (۳۰: ۳) اور لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَلَا يَسْتَحْسِرُونَ، يُسَبِّحُونَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ (۲۱: ۲)۔

پھر اللہ نے چاہا کہ اپنی بنائی ہوئی مخلوقات میں سے کسی کو اپنی وہ امانت سپرد کرے جو اس وقت تک کسی کو نہ دی گئی تھی۔ چنانچہ اس نے وہ امانت آسمان اور زمین کی مخلوقات میں سے ایک ایک کے سامنے پیش کی اور ہر ایک نے زبان حال سے اپنی ناقابلیت اور اپنے عدم تحمل کا اقرار کیا۔ آخرکار اللہ نے اپنی تخلیق کا جدید ترین ایڈیشن نکالا۔ جس کا نام انسان ہے اور اس نے بڑھ کر وہ بار امانت اٹھا لیا جس کے اٹھانے کی صلاحیت اور ہمت کسی دوسری مخلوق میں نہ تھی۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (۳۳: ۹)۔

یہ امانت کیا تھی؟ اللہ تعالیٰ کی ان مخصوص صفات، علم، قدرت، اختیار، ارادہ اور فرمانروائی، کا پرتو جو اس وقت تک کسی مخلوق پر نہ ڈالا گیا تھا۔ جس کے قبول کرنے کی صلاحیت نہ فرشتوں میں تھی، نہ اجرام فلکی میں، نہ پہاڑوں میں نہ زمین و آسمان کی کسی اور مخلوق میں۔ وہ صرف انسان تھا جو اپنی فطرت کے لحاظ سے اس پرتو کا متحمل ہو سکتا تھا۔ اس لئے اس نے یہ بار امانت اٹھا لیا۔ اور اسی لئے وہ اللہ کی خلافت و نیابت کے منصب پر سرفراز ہوا۔ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (۲: ۴)۔

اس بار امانت کے حامل، اس خلیفۃ اللہ فی الارض کی امتیازی خصوصیت، جس کی بنا پر وہ دوسری تمام مخلوقات سے ممتاز ہو گیا ہے، یہ ہے کہ وہ طبعاً اطاعت کیش نہیں بنایا گیا ہے[1]۔ اس کو عام مخلوقات کی طرح نظام کلی کے تحت قوانین و حدود الٰہیہ کا پابند بنانے کے ساتھ، ایک ایسی قوت بھی عطا کی گئی ہے جس کی وجہ سے وہ بخلاف دوسری مخلوقات کے، ایک خاص دائرہ میں مجبورانہ طاعت سے آزاد ہے، اور اتنا اختیار رکھتا ہے کہ چاہے اطاعت کرے اور چاہے سرکشی و نافرمانی کرنے لگے۔ یہ ایسا فرق ہے جو کلام

---

[1] یہ بات متعدد آیات قرآنی سے ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعًا (۱۰: ۱۰) اور وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا اَشْرَكُوْا (۶: ۱۳) وغیرہ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا خود یہ نہیں چاہتا تھا کہ انسان کو بجبر شرک سے روکے اور ایمان پر مجبور کرے۔

الٰہی میں تدبر کرنے والے کو صاف نظر آتا ہے۔ قرآن مجید میں آپ کو انسان کے سوا کسی اور ایسی مخلوق کا نشان نہ ملیگا جس کی طرف طاعت اور عصیان، فرمانبرداری اور نافرمانی، حدود اللہ کی پابندی اور ان حدود سے تجاوز، دونوں کو نسبت دی گئی ہو، اور جس کی طاعت پر جزا اور عصیان پر سزا کے مترتب ہونے کا ذکر کیا گیا ہو۔ وہ انسان ہی ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۲: ۲۹) وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ (۷: ۱۰) يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ (۴: ۹) مَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۷: ۲۰) وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ... وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا (۴: ۲) یہ اور ایسی ہی بے شمار آیات ظاہر کرتی ہیں کہ انسان میں بخلاف دوسری تمام مخلوقات کے ایک ایسی قوت موجود ہے جس سے وہ اطاعت اور سرکشی دونوں پر قدرت رکھتا ہے۔ اور اسی قوت کے صحیح یا غلط استعمال سے فوز یا خسران، ثواب یا عقاب، انعام یا غضب کا مستحق ہوتا ہے۔

ہدایت وضلالت قرآن اس مسئلہ کو اور زیادہ کھول کر بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا نے انسان کی فطرت میں بھلے اور برے دونوں کی تمیز ودیعت فرمادی فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا (۹۱) اس کو نیکی اور بدی دونوں کے راستے بتادئے وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (۹۰) پھر اس کو اختیار دیدیا کہ جس راہ کو چاہے اختیار کرے۔ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (۷۶: ۲) اور فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸: ۴) ایک طرف اس کو بہکانے کے لئے اس کا ازلی دشمن شیطان موجود ہے جو بدی کی راہ کو مزین کرکے اسے دکھاتا اور اس کی طرف رغبت دلاتا ہے۔ قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ

أَجْمَعِيْنَ (۱۵: ۳) اور دوسری طرف اللہ کی جانب سے رسول بھیجے جاتے ہیں، کتابیں نازل کیجاتی ہیں تاکہ انسان کو نیکی کا سیدھا راستہ بدی کی راہ سے ممتاز کرکے دکھائیں۔ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ وَبِالزُّبُرِ وَبِالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ (۳۵: ۲۵)۔ اس طرح انسان کے اندر اور اس کے گرد وپیش مختلف قوتیں ہیں جن میں سے کوئی اس کو بدی کی طرف کھینچنے والی ہے اور کوئی نیکی کی طرف ان قوتوں کے درمیان موازنہ کرنے کے لئے اس کو سمجھ بوجھ دی گئی ہے۔ اپنی راہ آپ دیکھنے کے لئے آنکھیں دی گئی ہیں، اور اتنی قدرت دی گئی ہے کہ وہ جس راہ کو پسند کرے اس پر چل سکے، اگر وہ بدی کی راہ کو اختیار کرتا ہے، تو اللہ اس کی تمام طبعی قوتوں، اور ان خارجی اسباب کو جو اس کے نصیب میں لکھدئے گئے ہیں اس کا تابع فرمان بنا دیتا ہے، اور یہ راہ اس کے لئے آسان ہوجاتی ہے۔ اسی طرح اگر وہ نیکی کا راستہ اختیار کرتا ہے تو وہ راہ بھی اس کے لئے آسان کردی جاتی ہے۔ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى (۹۲) جو شخص گمراہی اختیار کرتا ہے اس کے ضمیر میں ایک ایسی قوت پھر بھی موجود رہتی ہے جو اس کو راہ راست کی طرف دعوت دیتی رہتی ہے، مگر جب وہ اپنی کجروی پر اصرار کرتا ہے تو یہ قوت کمزور ہوتی چلی جاتی ہے، اور ضلالت کی بیماری بڑھتی جاتی ہے۔ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا (۲: ۲) یہاں تک کہ ایک وقت آتا ہے۔ جب اس قوت کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا اور اس شخص کے دل، آنکھوں، اور کانوں پر ایسی مہر لگ جاتی ہے کہ وہ حق بات کو سمجھ نہیں سکتا، حق کی روشنی کا ادراک نہیں کرسکتا، حق کی آواز سن نہیں سکتا، اور ہدایت کے تمام راستے اس کے لئے بند ہوجاتے ہیں۔ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (۲: ۱)

مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ انسان کا اختیار اور اس کی آزادی غیر محدود ہے۔

اور اس کو کلیۃً وہ اختیارات تفویض کردئے گئے ہیں جو قدریہ نے فرض کرلئے ہیں۔ ہرگز نہیں انسان کو جو کچھ اختیار دیا گیا ہے وہ یقیناً ان قوانین کے ماتحت ہے جو اللہ نے تدبیر کلی اور تدابیر جزئیہ کے لئے مقرر کر رکھے ہیں اور جن کے تحت یہ سارا کارخانۂ قدرت چل رہا ہے۔ کائنات کے نظام میں انسان کی قدرت، اور اس کی روحانی، نفسانی اور جسمانی قوتوں کے لئے جو حدود اللہ نے قائم کردی ہیں ان سے وہ ایک بال برابر بھی تجاوز کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ پس یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ اِنَّا خَلَقْنَا كُلَّ شَيْءٍ بِقَدَرٍ (۵۴: ۳) اور اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (۶۵: ۱) اور وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ (۶: ۲)

عدل اور جزا و سزا یہیں سے یہ نکتہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ حقیقی عدل کرنے والا بجز خدا کے اور کوئی نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ وہ حدود جن کے دائرے میں انسان کو اختیار حاصل ہے خدا ہی کی قائم کی ہوئی ہیں اور خدا ہی اس حقیقت کا جاننے والا ہے کہ انسان کے اعمال میں اس کے اپنے اختیار کا حصہ کتنا ہے۔ اس نے جن حدود سے انسان کے اختیار کو محدود کیا ہے ان کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم کے حدود وہ ہیں جو تمام نوع بشری کے لئے من حیث المجموع قائم کئے گئے ہیں۔ اور دوسری قسم کے حدود وہ ہیں جو ہر شخص کے لئے فرداً فرداً مختلف طور پر مقرر ہیں۔ پہلی قسم کے حدود نوعی حیثیت سے تمام اولاد آدم کے اختیار کو محدود کرتے ہیں۔ اور دوسری قسم کے حدود ہر شخص کے حالات کے لحاظ سے مختلف ہیں، اس لئے ان کے اعتبار سے ہر شخص کی زندگی میں اس کے اختیار اور اس کی مجبوری کی مقادیر جدا جدا ہیں۔ اپنے اعمال کے لئے انسان کا ذمہ دار ہونا اور اس ذمہ داری کے لحاظ سے جزا و سزا کا مترتب ہونا اسی مقدار اختیار پر موقوف ہے جس کو ہر شخص نے اپنے افعال میں استعمال کیا ہے، اور یہ وہ چیز ہے جس کو تولنا جانچنا، اور ایسا ٹھیک ٹھیک حساب لگانا کہ ایک ذرہ بھر بھی کمی وبیشی نہ ہو، دنیا کے کسی جج اور کسی مجسٹریٹ کے بس کا کام نہیں ہے یہ محاسبہ و موازنہ نہ صرف

فاطر السموٰت والارض ہی کر سکتا ہے اور وہی قیامت کے دن اس عدالت کا اجلاس کریگا۔ یہی بات ہے جس کی طرف کلام اللہ میں جگہ جگہ اشارہ کیا گیا ہے۔

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَ مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ۔ (۱:۷)	اس روز وزن بالکل ٹھیک ٹھیک ہوگا جن کے اعمال کے پلڑے بھاری ہوں گے وہی فلاح پائیں گے اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہ وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے ہماری آیات کے ساتھ ظلم کرکے اپنے آپ کو خود نقصان پہنچایا ہے۔
اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ۔ (۸۸)	ان کو ہماری ہی طرف آنا ہے اور ان کا حساب وکتاب ہمارے ہی ذمہ ہے۔
وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (۹۹)	جو ذرہ برابر نیک عمل کرے گا وہ اس کا نتیجہ دیکھ لیگا اور جو ذرہ برابر بُرا عمل کرے گا وہ اس کا نتیجہ دیکھ لیگا

قرآن مجید سے مسئلہ جبر و قدر پر بس اسی حد تک روشنی پڑتی ہے اور اس سے وہ گتھیاں سلجھ جاتی ہیں جو علوم طبیعیہ اور علم الاخلاق کے مباحث میں بیان کی گئی ہیں۔ رہے وہ مابعد الطبیعی مسائل جن میں فلاسفہ اور متکلمین الجھے ہوئے ہیں۔ یعنی یہ کہ اللہ کے علم اور اس کی معلومات، اس کی قدرت اور اس کے مقدورات، اس کے ارادہ اور اس کے مرادات میں کس نوع کا تعلق ہے، اور اس کے علم سابق ارادۂ ازلی اور قدرت مطلقہ کے ہوتے ہوئے انسان کس طرح با اختیار اور اپنے ارادہ میں آزاد ہو سکتا ہے تو ان مسائل سے قرآن نے کوئی بحث نہیں کی ہے، اس لئے کہ انسان ان کو سمجھ نہیں سکتا۔